باب 23

آزادی کے بعد کا ادبی منظرنامہ

1857 سے 1947 تک کے طویل دور میں ہماری قومی اور تہذیبی تاریخ اردو ادب کی تاریخ پر تقریباً ہر سطح پر اثر انداز ہوئی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں تسلسل اور تحرک پایا جاتا ہے۔ آزادی سے قبل کا اردو ادب آزادی کے نغموں سے معمور ہے۔ اُردو شاعری اور صحافت نے آزادی کی تحریک کو زبردست تقویت بخشی تھی۔ ہمارے قومی شعور کی تربیت میں بھی ان کا اہم حصّہ ہے۔ آزادی سے قبل 'ترقی پسند تحریک' اور 'حلقۂ اربابِ ذوق' نے جن نظریات کو بنیاد بنایا تھا ان کا تعلق نئے فلسفیانہ تصورات سے تھا۔ فن کی سطح پر بھی غیر معمولی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ روایت سے گریز کرنے کی کوشش کی گئی اور روایت کو ازسرِ نو قبول کرنے کی طرف بھی رغبت پیدا ہوئی۔ آزادی کے بعد کے اردو ادب میں اسے واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ہمارا ملک 1947 میں آزاد ہوا۔ آزادی کے حصول کے لیے ہم نے ہزاروں قیمتی جانوں کی قربانی دی تھی۔ آزادی کے ساتھ ہی ہمیں تقسیمِ وطن کے سانحے سے بھی گزرنا پڑا۔ یہ ایک بہت بڑا انسانی المیہ تھا، جو اردو ادیبوں پر شدّت کے ساتھ اثر انداز ہوا۔ اردو ادب میں یہ المیہ ایک ذاتی واردات کے طور پر نمایاں ہوا ہے۔ اس موضوع کے علاوہ اور بھی ایسے بہت سے موضوعات ہیں جنھیں مختلف ادیبوں نے اپنے اپنے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

غزل:

غزل اردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے۔ آزادی سے قبل فانؔی بدایونی، شادؔ عظیم آبادی، حسرؔت موہانی، اصغرؔ گونڈوی، یاسؔ یگانہ چنگیزی، جگؔر مرادآبادی اور فراقؔ گورکھپوری نے ایسے دور میں غزل کی روایت کو قائم رکھا جب نظم گو شعرا کی آوازیں چاروں طرف گونج رہی تھیں اور غزل کو سخت مخالفت کا سامنا تھا۔ یہ غزل نئے مضامین سے آراستہ تھی لیکن اسے کلاسیکی غزل کی روایت ہی سے وابستہ کرکے دیکھنا چاہیے۔ 1947 کے آس پاس ترقی پسند شعرا میں فیض احمد فیضؔ اور مجروحؔ سلطان پوری کی غزلوں میں ایک نیا رنگ ملتا ہے۔ ان کے لہجے میں تیکھا پن اور ایک خاص قسم کی طرح داری تھی۔ معین احسن جذبی کی غزل ان کے نرم لہجے سے پہچانی جاتی ہے۔

جدید رنگ کی غزل کا آغاز ابنِ انشا، ناصر کاظمی اور خلیل الرحمٰن اعظمی سے ہوتا ہے۔ اس غزل کا آہنگ دھیما اور طرزِ احساس نیا تھا۔ 1960 کے بعد جدیدیت کے زیرِ اثر غزل میں زبان و بیان کے بہت سے تجربے ہوئے۔ بانی، محمد علوی، زیب غوری، عادل منصوری، شہر یار، حسن نعیم، عرفان صدّیقی، خورشید احمد جامی اور مخمور سعیدی ایسے بہت سے نام ہیں جن کے یہاں غزل کے روایتی مضامین اور لفظیات سے دامن بچانے کی کوشش ملتی ہے۔ اس غزل میں نئے انسان کی ذہنی تشکیک، بے گانگی اور بے چینی کے موضوعات کو خصوصی طور پر برتا گیا ہے۔

پاکستان میں ابنِ انشا اور ناصر کاظمی کے علاوہ منیر نیازی، سلیم احمد، ظفر اقبال، احمد مشتاق اور شہزاد احمد کی غزلیں نئے مفاہیم و مضامین اور گوناگوں اسالیب کی حامل ہیں۔

نظم :

بیسویں صدی کا آغاز علاّمہ اقبالؔ کی نظم نگاری سے ہوتا ہے۔ جس طرح غالب نے گہری سنجیدگی اور گہری فکر سے غزل کو داخلی سطح پر وسعت بخشی تھی، یہی کام اقبال نے نظم میں انجام دیا۔ اقبال وہ پہلے شاعر ہیں جن کی فکر ہمہ گیر ہے اور جنھیں آفاقی شاعر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اقبال کے بعد جوشؔ ایک انقلابی شاعر کے طور پر نمودار ہوتے ہیں۔ انھوں نے انقلاب اور آزادی کے موضوع پر کئی اعلیٰ درجے کی نظمیں کہیں۔ 'ترقی پسند تحریک' اور 'حلقۂ اربابِ ذوق' سے وابستہ شعرا نظم کی طرف زیادہ مائل تھے۔ آزادی کے بعد بھی ان کا تخلیقی سفر جاری رہا۔ اکثر شعرا کی بہترین نظمیں آزادی کے بعد کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ترقی پسند شعرا نے اپنے عہد کے بعض اہم سیاسی اور سماجی موضوعات و مسائل کی طرف خاص توجہ دی۔ مجازؔ، فیضؔ، مخدومؔ، سردارؔ جعفری، کیفیؔ اعظمی، جاں نثار اخترؔ اور ساحرؔ لدھیانوی کا تخلیقی سفر آزادی کے بعد بھی جاری رہا۔ ن۔ م۔ راشد اور میراجی نے آزاد نظم کو فروغ دیا۔ ان کی نظمیں نئی حسّیت کی ترجمان ہیں۔ میراجی بنیادی طور پر تجربہ پسند تھے۔ انھوں نے تخلیقی زبان کے جس تصور کو فروغ دینے کی کوشش کی تھی، اس کی سب سے پہلی عملی صورت بھی انھیں کی نظموں میں ملتی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد بین الاقوامی سطح پر جو سیاسی انقلابات رونما ہو رہے تھے، راشد نے ان کے اثرات کو بھی اپنے خاص اسلوب میں پیش کیا ہے۔ راشد نے نئے انسان کی ذہنی اور نفسیاتی ناآسودگیوں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ اختر الایمان نے اپنی نظموں میں اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت کو خاص اہمیت کے ساتھ پیش کیا۔ اظہار کے طریقوں میں جو اختصار و توازن

اختر الایمان کی نظموں میں ملتا ہے، کم و بیش یہی صورت مجید امجد اور منیب الرحمٰن کی نظموں میں بھی نمایاں ہے۔ شفیق فاطمہ شعریٰ کے موضوعات اور مسائل فلسفیانہ نوعیت کے ہیں۔

1960 کے بعد جدیدیت کے رجحان کو فروغ حاصل ہوا۔ ہندوستان میں خلیل الرحمٰن اعظمی، عمیق حنفی، بلراج کومل، محمد علوی، ، شہریار، وحید اختر، شاذ تمکنت، کمار پاشی، مخمور سعیدی، عادل منصوری، زبیر رضوی اور شمس الرحمٰن فاروقی کی نظمیں اسی رجحان کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر شعرا اپنی نظم ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان شعرا نے ہیئت اور اسلوب کے تجربے کیے۔ وجودی فکر کو موضوع بنایا اور علامتی اور تخلیقی زبان استعمال کی۔ پاکستان میں جیلانی کامران، زاہد ڈار، عباس اطہر، وزیر آغا، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کی نظمیں نئے طرزِ احساس کی مظہر ہیں۔ اردو نظم کو نیا رنگ و آہنگ عطا کرنے میں ان کے تجربات کو خاص وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

ناول:

آزادی سے قبل پریم چند نے دیہات کے دبے کچلے عوام کی زندگی کو موضوع بنایا تھا۔ پریم چند کے فوراً بعد عزیز احمد، کرشن چندر اور عصمت چغتائی نے اپنے ناولوں کے ذریعے عصری زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ یہ سلسلہ آزادی کے بعد بھی جاری رہا۔

آزادی کے بعد عزیز احمد کے ناول 'ایسی بلندی ایسی پستی'، 'شبنم'، قرۃ العین حیدر کا 'میرے بھی صنم خانے' اور 'سفینۂ غمِ دل' منظر عام پر آئے۔ 'آگ کا دریا' کی اشاعت 1959 میں ہوئی، جس نے اردو ناول کی تاریخ کا رُخ ہی موڑ دیا۔ یہ ڈھائی ہزار برسوں پر پھیلی ہوئی ہندوستان کی تہذیبی تاریخ ہے۔ اِسے انسان کی تاریخ بھی کہا جا سکتا ہے جو ہر دور میں وقت کے جبر کا شکار رہا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے دوسرے ناولوں میں 'آخر شب کے ہم سفر' 'کارِ جہاں دراز ہے'، 'گردشِ رنگِ چمن'، اور 'چاندنی بیگم' کے علاوہ 'چار ناولٹ' بھی ہیں۔ یہ ناول قرۃ العین حیدر کے گہرے تاریخی، سیاسی اور تہذیبی شعور کے مظہر ہیں۔ نئے لکھنے والوں پر ملک کی تقسیم، فسادات اور تہذیبی بحران کا شدّت سے اثر ہوا۔ اردو فکشن نے ہجرت کے المیے کو خاص طور پر موضوع بنایا۔ اردو ناول کا یہ ایسا حاوی موضوع تھا جس کا اثر مدّتوں قائم رہا۔

اس کے علاوہ انسانی رشتوں کی شکست وریخت، انسانی قدروں کی پامالی، اخلاقی اور تہذیبی کشاکش، سیاسی بے حسی اور صارفیت سے پیدا ہونے والے خطرات اور مسائل کو بھی موضوع بنایا گیا۔ پاکستان کے بعض ناولوں میں آمرانہ اور جاگیردارانہ نظام کے ظلم وستم کی تصویر کشی ملتی ہے۔

آزادی کے بعد لکھے گئے چند اہم ناولوں کا اوپر ذکر کیا جاچکا ہے۔ ان کے علاوہ شوکت صدیقی کا 'خدا کی بستی'، راجندر سنگھ بیدی کا 'ایک چادر میلی سی'، جمیلہ ہاشمی کا 'تلاشِ بہاراں' اور 'آتشِ رفتہ'، خدیجہ مستور کا 'آنگن'، عبداللہ حسین کا 'اداس نسلیں' انتظار حسین کا 'بستی'، قاضی عبدالستار کے ناول 'شب گزیدہ' اور 'شکست کی آواز'، جیلانی بانو کا 'ایوانِ غزل'، احمد داؤد کا 'رہائی'، اعجاز راہی کا 'معتوب' اور مستنصر حسین تارڑ کا 'بہاؤ' بھی اس دور کے اہم ناول ہیں۔

ہندوستان میں 1980 کے بعد بعض اہم ناول منظر عام پر آئے۔ مثلاً عبدالصمد کا 'دوگز زمین'، پیغام آفاقی کا 'مکان'، حسین الحق کا 'فرات'، علی امام نقوی کا 'تین بتّی کے راما'، غضنفر کا 'پانی'، الیاس احمد گدّی کا 'فائرایریا'، سید محمد اشرف کا 'نمبردار کا نیلا' اور شمس الرحمٰن فاروقی کا 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' وغیرہ۔

افسانہ:

آزادی کے بعد اردو افسانے کو بے حد فروغ ملا۔ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر جن افسانہ نگاروں کے نام آتے ہیں، ان میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس اور احمد ندیم قاسمی قابلِ ذکر ہیں۔ کرشن چندر کا افسانوی فن حقیقت اور رومان کا سنگم کہلاتا ہے۔ بیدی نفسِ انسانی کی باریکیوں کے رمز شناس تھے۔ انھیں افسانے کے فن پر غیر معمولی قدرت تھی۔ احمد ندیم قاسمی نے پنجاب کی زندگی کے دُکھ سکھ اور تلخ وشیریں کو بڑے مؤثر ڈھنگ سے افسانوی پیرایہ عطا کیا ہے۔ عصمت چغتائی ایک بے باک افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اُن رسوم و رواج کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے جو انسان کی فطری آزادیوں پر قدغن لگاتے ہیں۔ خواجہ احمد عباس کے اکثر افسانے طبقاتی اونچ نیچ کے محور پر گشت کرتے ہیں۔ بعض افسانے تکنیک کے اعتبار سے فن کا عمدہ نمونہ ہیں۔ حیات اللہ انصاری کا شمار بھی اس دور کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

1947 کے آس پاس سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور غلام عباس کے افسانے اپنے منفرد اسلوب اور تکنیک کے لحاظ سے متوجہ کرنے لگے تھے۔ ان افسانہ نگاروں نے جدیدیت سے قبل نئے افسانے کے لیے فضا سازی کا کام کیا تھا۔ 1955-60 کے بعد بلراج مین را، سریندر پرکاش، خالدہ حسین، انور سجّاد، جوگندر پال،

غیاث احمد گدّی، الیاس احمد گدّی، اقبال مجید، کلام حیدری، انور عظیم، ضمیرالدین احمد، رتن سنگھ، عابد سہیل، جدید انسان کی بے چینیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ علامتی اور تجریدی افسانوں کے ابتدائی نقوش بھی انھیں افسانہ نگاروں کے یہاں ملتے ہیں۔ نیّر مسعود کے افسانے تجرید کے بجائے تکنیک کی سطح پر پیچیدگی کا احساس دلاتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے افسانے اپنی فضا اور اسلوب کے لحاظ سے ایک نئے تجربے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان افسانوں میں فنکاری کے ساتھ تہذیبی زندگی کی بڑی عمدہ مرقع کشی کی گئی ہے۔ قاضی عبدالستار، رام لعل اور جیلانی بانو نے زندگی کو اپنے اپنے طور پر معنی دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کے فن کا خاص وصف توازن ہے۔

جدیدیت نے اردو افسانے میں علامتی اور تجریدی اسلوب کو رواج دیا تھا۔ ان افسانہ نگاروں کی ترجیح حقیقت نگاری کے مخصوص تصوّر کے برخلاف ذات اور وجود کا تجربہ تھی۔ کرداروں کی شناخت غائب ہوگئی تھی جس کے باعث ابہام کا مسئلہ بھی پیدا ہوا۔ 1980 کے بعد پروان چڑھنے والی نسل نے بیانیے کی روایت کو دوبارہ رائج کرنے کی کوشش کی۔ یہ نسل اسلوب سے زیادہ تکنیک کے تجربے کی طرف مائل ہے۔ صارفیت کے بڑھتے ہوئے فروغ کے باعث انسانی رشتوں میں جس قسم کا انتشار پایا جاتا ہے، نئے افسانہ نگاروں نے اسے بھی موضوع بنایا ہے۔ اس نسل کے چند نمائندہ نام یہ ہیں:

سلام بن رزاق، انور خاں، انور قمر، شموئل احمد، عبدالصمد، ذکیہ مشہدی، شوکت حیات، شفق، سید محمد اشرف، مشرف عالم ذوقی، طارق چھتاری وغیرہ۔

ڈراما:

آزادی کے بعد دیگر اصناف کی طرح ڈرامے کا فن بھی ترقی کرتا رہا۔ کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری اور بلراج ساہنی کے ڈراموں میں ترقی پسند نظریے کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ ان کے علاوہ محمد حسن کے ڈرامے 'محل سرا'، 'فٹ پاتھ کے شہزادے'، 'کہرے کا چاند'، 'مٹی جاگتی ہے'، 'ضحاک' وغیرہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ حبیب تنویر کے 'آگرہ بازار' ایک کامیاب ترین اسٹیج ڈراما ہے جس نے کافی شہرت پائی۔ ابراہیم یوسف کے ڈرامے 'پرچھائیوں کا پیچھا'، 'کاغذ کی دھجی'، 'الجھاوے'، 'زمرّد کا گلوبند'، 'گرتی برف'، 'ٹیپو سلطان' وغیرہ کا شمار بھی اسٹیج ڈراموں میں ہوتا ہے۔ ان ڈراموں کا پس منظر آزادی کے بعد کی وہ زندگی ہے جسے اپنے خوابوں کی تعبیر ابھی تک نہیں مل سکی ہے۔ ان ڈراموں میں آزادی کے بعد کی سماجی اور تہذیبی زندگی کے نشیب و فراز کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ڈرامے اپنی فکر کے لحاظ ہی سے نہیں، فن کے لحاظ سے بھی متوجہ کرتے ہیں۔

1960 کے بعد بعض ایسے ڈرامے بھی تخلیق ہوئے جنھیں فنی اعتبار سے تجرباتی کہا جاتا ہے۔ ان میں انور عظیم کا 'آوازوں کا قیدی' کمار پاشی کا 'جملوں کی بنیاد'، شمیم حنفی کا 'پانی۔ پانی' زاہدہ زیدی کا 'چٹان' اور 'دوسرا کمرہ'۔ عتیق اللہ کا 'پیچھے کوئی ہے' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان ڈراموں پر سیموئل بیکٹ، آئنسکو اور ژان ژینے کا گہرا اثر ہے۔ ان ڈراموں کا خاص موضوع انسان کی داخلی بے چینی ہے۔ انسان اپنی ذات میں تنہا اور بے یارو مددگار ہے۔ ڈراما اکثر ایسے وقوعوں Happenings سے گزرتا ہے جنھیں عجیب وغریب ہی نہیں مضحک بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے ڈراموں کے برعکس فضل تابش، اقبال مجید، ظہیر انور، شاہد انور، سعید عالم، انیس اعظمی، اقبال نیازی اور رشید انجم نے ہمارے عہد کی ذہنی اور تہذیبی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ ان نئے ڈراما نگاروں نے اسٹیج کی ضروریات اور اسٹیج کے تقاضوں کا بھی خیال رکھا ہے۔ آزادی سے قبل بھی اردو اسٹیج ڈراموں کی مقبول زبان تھی اور اب بھی اردو ڈرامے لکھے اور اسٹیج کیے جا رہے ہیں۔

تنقید:

'تنقید' لغت میں اچھے برے کی پہچان اور پرکھ کو کہتے ہیں۔ ادب میں 'تنقید' کا مطلب ہوتا ہے کسی فن پارے کو پڑھ کر اس پر اپنی رائے دینا۔ لیکن یہ رائے روا روی میں نہیں دی جاتی بلکہ اس کے کچھ اصول اور قاعدے ہوتے ہیں۔ انہی کے تحت کسی فن پارے پر اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔ تنقید میں مہارت رکھنے والے کو 'تنقید نگار' یا 'نقاد' کہتے ہیں۔

اس گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ عام آدمی ادب کا مطالعہ صرف لطف اندوزی کے لیے کرتا ہے۔ وہ مطالعے کے بعد اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار بھی کر سکتا ہے لیکن یہ رائے بہت محدود ہوتی ہے مثلاً یہ کہ مجھے یہ افسانہ پسند ہے یا ناپسند۔ یہ نظم اچھی ہے یا اچھی نہیں ہے لیکن وہ اپنی پسند یا ناپسندیدگی کے اسباب پر تفصیلی روشنی نہیں ڈال سکتا۔ اس کے برخلاف نقّاد ماہرِ فن ہوتا ہے اس لیے وہ فن پارے پر اپنی رائے کا اظہار ماہرِ فن کی طرح کرتا ہے۔

تنقید نگار یا نقاد کے دو اہم منصب ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ زیرِ بحث فن پارے کی تشریح وتفسیر کرے مثلاً پہلے یہ بتائے کہ وہ جس کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے اس میں کن مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ ان میں کیا باریکیاں اور نکتے ہیں اور لکھنے والے کا مدّعا کیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تنقید کا مطالعہ کرنے والا عام قاری بھی ان مسائل کی باریکیوں سے واقف ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد نقاد کا دوسرا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ فن پارے کا تجزیہ کرکے یہ بتائے کہ

شاعر یا ادیب اپنی تخلیق میں کس حد تک کامیاب ہے۔ مواد اور ہیئت میں کامل ہم آہنگی پائی جاتی ہے یا نہیں؟ وہ تخلیق جس صنف ادب سے تعلق رکھتی ہے، اس کے تقاضوں کو اس میں ملحوظ رکھا گیا ہے یا نہیں۔ اگر فن کار نے کوئی نیا تجربہ کیا ہے تو وہ تجربہ ہمیں کن نئی جہتوں سے آشنا کراتا ہے۔ نقاد ان مسائل سے بحث کرتے ہوئے اصول و قواعد کے حوالے دیتا ہے۔ پھر کبھی ان سے موافقت کا اظہار کرتا ہے اور کبھی اختلاف کرتا ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی ہمارے پرانے مفروضات کو رد کرتا اور ہمیں غور و فکر کے لیے آمادہ کرتا ہے۔

آزادی کے بعد ان نقادوں نے بھی اپنا سفر جاری رکھا جو آزادی سے قبل اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ ان میں کلیم الدین احمد، احتشام حسین، ممتاز حسین اور محمد حسن عسکری تھے۔ آزادی کے بعد جن نقادوں نے تنقید کو کئی نئی جہتوں سے آشنا کیا ان میں بیش تر وہ ہیں جن کا تعلق جدیدیت کے مکتب فکر سے تھا۔ بعض نقادوں کے یہاں ترقی پسند تصورِ فن اور جدیدیت کا امتزاج ملتا ہے۔ بعض ناقدین مابعدِ جدید تصورات کے حامل ہیں۔ ان میں وزیر آغا، محمد حسن، گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی، عتیق اللہ، ابوالکلام قاسمی اور قاضی افضال کے نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

انشائیہ:

کہا جاتا ہے کہ ادب لفظوں کا کھیل ہے۔ کسی دوسری ادبی صنف کے بارے میں شاید یہ خیال صحیح نہ ہو لیکن انشائیہ ایک ایسی صنف ہے جس میں انشائیہ نگار زیادہ سے زیادہ آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ لفظوں سے کھیلتا ہے۔ ذہن کی آزاد رَو پر وہ کوئی حد قائم نہیں کرتا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی سنجیدگی کب غیر سنجیدگی میں بدل جائے اور غیر سنجیدگی، سنجیدگی میں۔ کبھی وہ دوسروں کی حماقتوں پر ہنستا اور ہنساتا ہے، کبھی خود اپنی حماقتوں پر دوسروں کو ہنسنے کا موقع دیتا ہے۔

ایک اچھے انشائیے میں اکثر بیان کی دو سطحیں ہوتی ہیں۔ پہلی سطح پر وہ ہمیں فرحت مہیا کرتا ہے۔ دوسری سطح پر ممکن ہے کوئی سنجیدہ اور گہری بات چھپی ہو جو ایک دم انکشاف کی صورت میں عیاں ہو کر ہمیں بصیرت بھی بخش سکتی ہے۔ بہر حال انشائیے کا بنیادی مقصد لطف اندوزی ہے شاید اسی لیے کسی نے اسے 'خیال کی ترنگ' کا نام دیا ہے۔

آزادی کے بعد جن ادیبوں نے انشائیہ نگاری کو فروغ دیا ان میں فرقت کاکوروی، کنھیّا لال کپور، مرزا محمود بیگ، تخلّص بھوپالی، شوکت تھانوی، وزیر آغا، مشتاق احمد یوسفی، فکر تونسوی، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، نریندر لوتھرا اور شفیقہ فرحت کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

صحافت :

آزادی کے بعد اردو کو درپیش مشکلات کے باوجود اردو صحافت بدستور فروغ پاتی رہی۔ اس نے ملک اور قوم کی غیر معمولی خدمت انجام دی ہے۔ چنانچہ اردو اخبارات و رسائل کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کی رپورٹ کے مطابق 1996 میں اُردو کے روزانہ، سہ روزہ، ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہنامہ، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ اخباروں اور رسالوں کی مجموعی تعداد 1567 تھی۔ اب اردو اخبارات کی طباعت کا معیار بھی بلند ہو گیا ہے۔ خبر رسانی کے ذرائع نے بھی غیر معمولی ترقی کر لی ہے جن سے اردو اخبارات پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ دیدہ زیب طباعت اور مختلف النوع مسائل اور مضامین کی بنا پر اردو قارئین کا حلقہ بھی کافی وسیع ہو گیا ہے۔ انقلاب، اردو ٹائمز، سیاست، منصف، قومی آواز، راشٹریہ سہارا، آزاد ہند، سالار اردو کے مقبول ترین روز نامے ہیں۔ ان میں سے بعض اخبارات بیک وقت کئی شہروں سے شائع ہو رہے ہیں۔ ماہانہ رسالوں میں 'شب خون' (الہ آباد)، 'شاعر' (ممبئی)، 'معارف' (اعظم گڑھ)، 'نیا دور' (لکھنؤ)، 'سب رس' (حیدرآباد)، 'آج کل' (دہلی)، 'ایوانِ اُردو' (دہلی)، 'کتاب نما' (دہلی)، اردو دنیا (دہلی)، سہ ماہی رسالوں میں 'اثبات' (ممبئی)، 'اردو ادب' (دہلی)، 'فکر و نظر' (علی گڑھ)، 'جامعہ' (دہلی)، 'فکر و تحقیق' (دہلی)، 'ذہنِ جدید' (دہلی)، 'نیا ورق' (ممبئی)، 'محاسبہ' (پٹنہ)، 'نئی کتاب' (دہلی) اور ہفت روزہ جرائد میں 'ہماری زبان' (دہلی)، 'عالمی سہارا' (دہلی) اور 'اخبارِ نو' (دہلی) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

سرحد کے اس پار سے نکلنے والے رسائل اور اخبارات میں 'نگار'، 'نقوش'، 'فنون'، 'اوراق'، 'سویرا'، 'ادبِ لطیف'، 'مکالمہ'، 'آج'، 'دنیا زاد' اور روز ناموں میں 'مشرق'، 'جنگ'، 'نوائے وقت' وغیرہ بھی معروف ہیں۔

خاکہ نگاری :

خاکہ نہ تو سوانحی مضمون ہوتا ہے اور نہ محض تاثراتی تحریر۔ ایک اچھے خاکے میں خاکہ نگار متعلقہ شخصیت کے کچھ واقعاتِ زندگی، اس کی سیرت کے کچھ پہلوؤں اور اپنے تاثرات کے امتزاج سے ایک جیتی جاگتی تصویر بناتا ہے۔ یہی تصویر ادبی اصطلاح میں خاکہ کہلاتی ہے۔ اردو میں خاکہ نگاری کی روایت 'آبِ حیات' کے قلمی مرقعوں سے شروع ہوتی ہے۔

آزادی کے بعد اس صنف کے معروف لکھنے والوں میں عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر عابد حسین، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر اعجاز حسین، سعادت حسن منٹو، سردار دیوان سنگھ مفتوں، عصمت چغتائی، محمد طفیل، انتظار حسین، بیگم صالحہ عابد حسین، علی جواد زیدی، کرشن چندر، ظ۔ انصاری، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، یوسف ناظم، تخلّص بھوپالی، سید حامد حسین، سید ضمیر حسین دہلوی، نور الحسن نقوی، اسلم پرویز، خلیق انجم اور مجتبیٰ حسین وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

رپورتاژ :

رپورتاژ ایک نئی صنف ہے۔ یہ لفظ رپورٹ کا فرانسیسی تلفظ ہے۔ رپورٹ کے ایک معنی روداد کے ہیں۔ روداد کسی واقعے کا بیان ہوتی ہے۔ ادب میں کسی جلسے، مذاکرے یا سیمینار کی ایسی تفصیلی روداد کو رپورتاژ کہا جاتا ہے جس کی زبان افسانوی ہوتی ہے۔ رپورتاژ نگار اپنی روداد کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کے لیے ایک ایک جُز کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ شرکائے جلسہ کی تحریروں کے بارے میں وہ اپنی اور دوسروں کی رائے شامل کر کے اس روداد کو دلچسپ بناتا ہے۔

اردو کے اوّلین رپورتاژ نگاروں میں حمید اختر، کرشن چندر اور سجّاد ظہیر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ آزادی کے بعد جن ادیبوں نے رپورتاژ لکھے، ان میں بیشتر افسانہ نگار تھے۔ ان کی روداد میں افسانویت کے ساتھ ڈرامائیت بھی پائی جاتی ہے۔ عادل رشید، سجاد ظہیر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، فکر تونسوی، پرکاش پنڈت وغیرہ کے رپورتاژ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

مہجری ادب (Urdu Diaspora):

ہجرت، عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے لغوی معنٰی ہیں اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسرے وطن میں سکونت اختیار کرنا لیکن ہجرت کے اصطلاحی معنی میں بڑی وسعت ہے۔ ایک خاص اور بنیادی معنی تو ہجرتِ نبویؐ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض وجوہ سے جب حضورؐ اور دیگر صحابہ کرامؓ پر مکّے کی زمین تنگ ہوگئی تو انھوں نے دارالامان کے طور پر مدینے کی سرزمین کو اپنی جائے پناہ ہونے کا اعزاز بخشا۔ عالمی تاریخ میں عدم تشدد کی یہ ایک گراں قدر مثال ہے۔

ہجرت یا ترکِ وطن کے پیچھے ہمیشہ سیاسی جبر ہی کام نہیں کرتا بلکہ ایک خوش حال اور بہتر زندگی کا تصور بھی ترکِ وطن کے لیے تحریک کا باعث بن سکتا ہے۔ بیسویں صدی میں کاروبار کی توسیع یا روزگار جیسی اغراض نے انفرادی طور پر نئی نسلوں کو ترکِ وطن کی طرف مائل کیا۔ اس طرح موجودہ عہد میں ہجرت کے پیچھے معاشی اسباب کی زیادہ کارفرمائی ہے۔

اردو کے مہاجر ادیب و شاعر دنیا کے کئی ملکوں میں بسے ہوئے ہیں۔ ان میں کینیڈا، شمالی امریکہ، برطانیہ، ناروے، سویڈن، جرمنی، روس، آسٹریلیا اور مشرقِ وسطٰی کے کئی ممالک شامل ہیں۔ ان مہاجر ادبا و شعرا نے دیارِ غیر میں بعض ادبی ادارے بھی قائم کیے ہیں۔ ان اداروں کو سرکاری فنڈز بھی ملتے رہے ہیں۔ شمالی امریکہ کا 'اردو انٹرنیشنل' ایک فعال ادارہ ہے۔ اردو ادب اور اردو تہذیب سے رشتہ جوڑے رکھنے کے لیے ان مہاجر ادیبوں نے بعض ممالک سے اردو جریدے بھی شائع کیے ہیں۔ ان میں مقصود الٰہی شیخ کا 'مخزن' (بریڈفورٹ۔ برطانیہ) ساحر شیوی کا 'سفیر اردو' (لندن) اور جرمنی سے شائع ہونے والا حیدر قریشی کا رسالہ 'جدید ادب' برصغیر میں بھی مقبول ہیں۔ ان رسائل کے علاوہ اخبارات بھی شائع ہوتے ہیں جن میں ان نئی بستیوں کے ادیبوں کی تخلیقات ہی شائع نہیں ہوتیں بلکہ برصغیر ہندو پاک کے اکثر شاعروں اور افسانہ نگاروں کی نگارشات بھی ان میں شامل ہوتی ہیں۔ اردو کے ان مہاجر ادیبوں

کے ادبی اثاثے میں شعری وافسانوی مجموعوں کے علاوہ تنقید، تحقیق، صوتیات، سوانح عمریاں، سفرنامے، لغت ومنقبت اور شکاریات پر بھی کتابیں شامل ہیں۔ شمالی امریکہ میں پروفیسر مامون ایمن، نیر جہاں اور صفوت علی صفوت اردو کی شعری روایات کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ کینیڈا میں اشفاق احمد، پروین شیر، سید تقی عابدی اور ستیہ پال آنند کے نام ان کے گونا گوں ادبی کارناموں کی وجہ سے بہ طور خاص قابل ذکر ہیں۔ سید تقی عابدی نے دبیر، غالب اور فیض کے تعلق سے تحقیق کے نئے گوشوں پر توجہ کی ہے۔ اشفاق احمد کی نئی تصنیف 'مسیحا فیض' فیض شناسی میں ایک گراں قدر کارنامے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ستیہ پال آنند جدید اردو نظم کا جانا پہچانا نام ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ برطانیہ میں مقصود الٰہی شیخ 'مخزن' کے مدیر ہیں۔ وہ خود ایک لائق افسانہ نگار ہیں۔ ساقی فاروقی ایک منفرد اسلوب کے شاعر ہیں۔ لندن میں رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی سوانح 'آپ بیتی / پاپ بیتی' کے نام سے شائع کی ہے۔ الٰہی بخش اختر اعوان بھی لندن میں رہتے ہیں۔ علاقائی زبانوں پر اردو کے اثرات اور ان کے تقابلی مطالعے پر ان کا کام اہمیت رکھتا ہے۔ فیض احمد فیض، افتخار عارف اور عادل منصوری کی زندگی کا ایک بڑا عرصہ مغربی ممالک میں گزرا۔ ن۔م۔راشد کی شاعری کا بیش تر حصّہ ترکِ وطن کے بعد کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ احمد مشتاق جیسے اہم غزل گو شاعر کا قیام بھی لندن میں ہے۔ افتخار نسیم بھی منفرد لہجے کے شاعر تھے۔ ضیاء الدین شکیب نے تحقیق کے وقار کو ان بستیوں میں قائم رکھا۔ ڈاکٹر احمد سہیل مابعدِ جدید نقاد کی حیثیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

قیصر تمکین اور اکبر حیدر آبادی برطانیہ میں سکونت پذیر ہیں۔ 'شعر و نظر' اور 'تنقید کی موت' قیصر تمکین کی تنقیدی کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی کہانیوں کے پانچ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اکبر حیدر آبادی شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے ہیں۔

سائیں سچا، جمشید مسرور، ہر چرن چاولہ، یہ تینوں افسانہ نگار قطب شمالی کے پڑوسی ممالک میں سکونت پذیر ہیں۔ ادب میں ان کے افسانوں کا خاص مقام ہے۔ ان لوگوں نے اردو ادب کو وہاں کی مقامی زبانوں میں ڈھالا اور مقامی ادب کو اردو میں پیش کیا۔ آسٹریلیا میں معمر ادیبہ، ساوتری گوسوامی آج بھی افسانے لکھ کر اردو کے چراغ کو آسٹریلیا میں روشن کیے ہوئے ہیں۔ جرمنی میں حیدر قریشی، نعیمہ ضیا وغیرہ اردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ عرب امارات میں ع۔م۔سلیم، حنیف ترین وغیرہ کی خدمات کو بھلایا نہیں جا سکتا۔

اس طرح ساری دنیا میں اردو کے مہاجر ادبا و شعرا اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس طرح یہ کوششیں اردو سے ان کے دلی لگاؤ کی مظہر بھی ہیں اور غیروں کی تہذیب کے درمیان اردو تہذیب کو زندہ رکھنے کی کوشش کی علامت بھی۔